© rasailojaraid.com

غواص القرآن حافظ محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ

محمد اعظم سعیدی

کل شیء یرجع الی اصلہ۔ عالم بقاء سے عالم فنا میں آئے اور پھر عالم بقاء کو لوٹ گئے، آہ ترجمان القرآن حضرت حافظ محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیں عالم دنیا میں تنہا کر گئے۔ ان کے انتقال سے قرآن فہمی کا ایک باب بند ہو گیا، قرآن کی روشنی سے قلب و دماغ کو مستنیر کرنے والا ایک درخشاں ستارہ غروب ہو گیا، قرآن کا ورک رکھنے والی کہکشاں کا ایک اور ستارہ ڈوب گیا، خدا اس پاک طینت و پاک سرشت پر اپنی رحمتوں کا سایہ فرمائے (آمین)

حافظ صاحب مرحوم کا علم بڑا مستند تھا اور کثرت مطالعہ سے شدید ورق بھی۔ اگرچہ کتب احادیث وفقہ پر انہیں عبور تھا۔ مگر قرآن کو صرف قرآن سے ہی سمجھنا انہیں منظور تھا۔ قرآن سے قلبی لگاؤ اور گہری محبت کا یہ عالم تھا کہ کم و بیش ۶۰ سال (گذشتہ رمضان) تک تراویح میں قرآن سنایا۔ یعنی پیرانہ سالی اور مختلف امراض کی حملہ آوری انہیں قرآن مجید پڑھنے، رکھنے، سمجھانے اور سنانے سے باز نہ رکھ سکی۔ حتی کہ ایام مرض میں بھی تلامذہ کو تفسیر پڑھاتے رہے۔ ان کی درس گاہ ان کے فلیٹ کا ایک کمرہ تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ واحد درسگاہ تھی جو چندے اور فیس سے مبرا تھی۔ دوسرا کمرہ نادر و نایاب کتب سے معمور مطالعہ گاہ تھا۔ جبکہ ایک کمرہ ہونہار صاحبزادی اور سلیقہ شعار بیوی کیلئے وقف تھا۔ یہ ہے کل کائنات اس عالم قرآن کی جو ہزاروں دلوں میں بستا ہے۔ اگرچہ غائبانہ طور پر ہم ایک دوسرے کے بہت پہلے سے شناسا تھے۔ مگر ان سے بالمشافہ پہلی ملاقات ۱۹۸۶ء میں پیر مہر علی شاہ گولڑوی پر منعقدہ ایک سیمینار میں ہوئی تھی۔ یہ ملاقات اگرچہ مختلف نظریات کے ٹکراؤ کے باعث یادگار بن گئی۔ مگر دوران بحث حافظ صاحب مرحوم کے بکثرت قرآنی آیات کو بطور دلیل تلاوت کرنے پر ان کی قرآن سے گہری رغبت کا رعب میرے دل میں ضرور سما گیا۔ پھر گاہے گاہے مختلف محافل و سیمینارز میں ملاقاتوں کے تسلسل سے ان کی علمی وسعتیں مجھ پر آشکار ہوتی رہیں۔ اور یوں ذہنی و قلبی قربتیں بھی بڑھتی رہیں۔ غرض کہ ان کی طرف سے بے پناہ محبت کے اظہار اور میری جانب سے عقیدت کے اقرار نے ہمیں یک جان دو قالب کر دیا (من تو شدم تو من شدی)

حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رواداری کا ایک واقعہ اس طرح ہے کہ مصر کے مفتی امام خرپوتی

© rasailojaraid.com

نے بارہویں صدی ہجری میں قصیدہ بردہ کی علم منطق، کلام، معانی، بدیع، جغرافیہ اور تاریخ کے حوالے سے بڑی مبسوط و ضخیم شرح عصیدۃ الشہدہ کے نام سے لکھی تھی۔ اس پر چار دیگر علماء کے حواشی بھی تھے۔ حضرت حافظ صاحب اس کا قلمی نسخہ مصر سے لائے تھے اور اس کا اردو میں ترجمہ کرانے کی تمنا رکھتے تھے۔ چونکہ پیرانہ سالی کے باعث خود لکھنے سے عاجز تھے، اس لئے مختلف علماء سے معقول معاوضہ پر ترجمہ کر دینے کی استدعا کی مگر کئی سال تک مختلف ہاتھوں سے ہو کر وہ کتاب من و عن ان کے پاس آ گئی۔ ۸ نومبر ۲۰۰۰ء کو رمضان کے مہینے میں مولانا انور احمد شہباز عصیدۃ الشہدہ شرح قصیدہ بردہ لیکر میرے پاس آئے اور کہا کہ اس کے پہلے دو صفحات کا ترجمہ کر دیں۔ کل آکر لے جاؤں گا۔ دوسرے دن میں ترجمہ کر کے انہیں دے دیا۔ پھر ایک ہفتہ بعد شہباز صاحب نے ہی آکر بتایا کہ اس کتاب کا ترجمہ کریں۔ اور یہ کتاب حافظ محمود الحسن صاحب کی ہے۔ یہ بھی بتا دیں کہ محنتانہ کیا لیں گے۔ یہ سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ حافظ صاحب نے مجھ سے خود کیوں نہیں فرمایا، اس واسطے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر سوچا کہ جو شخص لحاظ داری، رواداری، ملنساری، وفاداری، عاجزی و انکساری جیسی صفات کا مجسم پیکر ہو، وہ اپنے عقیدت مند سے محنتانے کی بات کیسے کر سکتا ہے۔ بہر حال میں نے اس ضخیم شرح کا ترجمہ کر دیا۔ پھر وہ ترجمہ تین سال پہلے محمد ریاض گوداوالا بغرض اشاعت لے گئے تھے۔ جسے تاحال وہ نہیں چھاپ سکے، اب انشاء اللہ حافظ صاحب مرحوم کی پہلی برسی پر وہ ترجمہ شائع کر دیا جائیگا۔ عصیدۃ الشہدہ وہ شرح ہے جس نے ہماری ملاقاتوں میں اضافہ کر دیا۔ حافظ صاحب علیہ الرحمۃ کے روزانہ کے معمولات میں یہ تھا کہ آپ بعد نماز ظہر قیلولہ فرماتے۔ پھر علماء اور آئمہ و خطباء کو تفسیر قرآن پڑھاتے۔ عصر سے مغرب تک اپنے والد مرحوم کی قبر پر بلاناغہ قرآن کی تلاوت کرتے۔ میں ہر دوسرے، تیسرے دن حاضر ہوتا تو زیر درس آیت کے حوالے سے مجھ سے مخاطب ہو جاتے اور اس کی توضیح و تشریح میں دیگر آیات سے استدلال فرماتے۔ مفسرین و مؤرخین کی تحریر کردہ اسرائیلی روایات کو در خور اعتناء نہ سمجھتے تھے۔ وہ اس یقین کے مالک تھے کہ قرآن خود ہی متن ہے اور خود ہی مفسر ہے۔ دو سال پہلے مغفرت ذنب کے مسئلے پر حافظ صاحب نے ذنب، اثم، حوب، خطاء، جناح اور معصیت جیسے لفظوں کی ادب و لغت، صرف و نحو، معانی و لسانی اور اقوال مفسرین و فقہاء سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف قرآن سے مدد لے کر خوب تحقیق فرمائی تھی اور وہ تحقیق تین آڈیو کیسٹ میں ریکارڈ ہے جو ان کے ایک شاگرد عزیز کے پاس محفوظ ہے۔

ایک دفعہ آئمہ و خطباء کی کلاس کو سورہ بقرہ کی آیات ۲۳۴ تا ۲۴۲ کا درس دے رہے تھے۔ اسی وقت مسودہ لے کر میں بھی حاضر ہو گیا۔ حسب روایت مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا، کیا ابلیس فرشتوں میں

© rasailojaraid.com

سے تھا؟ کیا فرشتوں کا استاد بھی تھا؟ میں نے کہا نہیں قرآن میں ہے وکان من الجن، پھر فرمایا کیا کچھ فرشتے آگ سے پیدا کیے گئے تھے اور ابلیس بھی ان میں سے تھا؟ میں نے کہا نہیں فرشتے صرف نور سے پیدا ہوئے ہیں جبکہ ابلیس آگ سے، پھر فرمایا کیا آدم کو پھسلانے کے لیے ابلیس سانپ بن کر جنت میں گیا تھا؟ میں نے کہا نہیں یہ تو درست ہے کہ ابلیس کوئی سا بھی روپ دھار سکتا ہے، مگر وہ جنت سے خروج کے بعد دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا اور اگر داخل ہو گیا تو پھر یہ دخول دائمی ہوگا وہ واپس باہر نہیں آسکے گا، اگر ابلیس نے جنت میں جا کر آدم وحوا سے کچھ کہا ہوتا تو قرآن میں فقال لھما الشیطن ہوتا جبکہ قرآن میں الفاظ لھما الشیطن اور فوسوس الیہ الشیطان ہے، جس طرح وائرلیس سے ریڈیائی لہروں کے ذریعے دوسرے بندے کو پیغام پہنچایا جاتا ہے اسی طرح شیطان نے بھی جنت سے باہر رہ کر وسوسہ جیسی لہروں کے ذریعے اپنی بات آدم وحوا سے کہی ہوگی میرا جواب سن کر حافظ صاحب فرمانے لگے، میں ڈیڑھ گھنٹے سے اسی پر دلائل دے رہا ہوں کہ ابلیس نہ فرشتہ تھا نہ فرشتوں کا استاد تھا، اور حضرت سعید بن جبیر کا یہ قول کہ بعض فرشتے آگ سے تخلیق کیے گئے تھے غیر صحیح ہے اور ابلیس کسی بھی صورت میں جنت میں نہیں گیا۔ حافظ صاحب کا ڈیڑھ گھنٹے تک اس عنوان پر دلائل دیتے رہنا میرے لیے حیران کن اس لیے نہیں تھا کہ میں ان کی علمی وسعتوں سے واقف تھا اور وہ واقعی بحر العلوم تھے۔

حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات سے چند ماہ قبل میں نے ان کی خدمت میں جانا کم کر دیا تھا۔ اور اس کا سبب میں نے دیگر دوستوں کے علاوہ ڈاکٹر محمد شکیل اوج اور مولانا عبد الکریم سیالوی (جامعہ باب القرآن) کو بھی بتایا تھا۔ اور اب سب کو بتا رہا ہوں کہ حافظ صاحب مرحوم بہت ہی دردمند دل کے مالک تھے، دوستوں کو تکلیف میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے، میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ حضرت موصوف نے کتنے ہی علماء اور مدارس دینیہ کی ان کی توقع سے بڑھ کر مدد کروائی تھی۔ یکم نومبر ۲۰۰۶ کو ایک دار العلوم کی افتتاحی تقریب سے واپسی پر مجھے روڈ پر گاڑی کے انتظار میں کھڑا دیکھ کر تڑپ اٹھے، پھر رات کو فون کر کے فرمایا کہ میں تمہارے لئے کسی سے کہہ کر گاڑی کا انتظام کرواتا ہوں۔ لیکن انکار نہیں سنوں گا، پھر ان کی صحت روز بروز گرتی رہی اور عمر بھی ۸۷ برس پہنچی ہوئی تھی، میں نے اسی لیے حاضری کم کر دی تھی کہ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ میں اسی مطلب سے آتا ہوں، البتہ ٹیلیفون پر رابطہ جاری رہا اور میں یہ بات جانتا ہوں کہ اگر میں اپنی حاضری حسب معمول رکھتا تو وہ اپنی بیماری بھول کر میری تیمارداری میں لگ جاتے۔

حافظ محمود الحسن صاحب قرآن مجید کا فہم وادراک رکھنے والے عالم دین تھے اور پھر پاکستان میں

تھے جہاں قرآن کا علم رکھنے والوں سے محبت کم نفرت زیادہ کی جاتی ہے۔ اگر یہ فنکار ہوتے تو حکومت ان کا علاج کرواتی اور ان کے فن کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے بچوں کیلئے مالی امداد یا نوکری کا انتظام کرتی لیکن حافظ صاحب تو قرآن کے عالم تھے؟ ان کی معنوی اولاد تو بجز سینکڑوں تلامذہ کے کوئی نہیں۔ البتہ سائیکالوجی میں ایم اے ان کی تعلیم یافتہ اکلوتی صاحبزادی کو حکومت یا کوئی ادارہ باوقار نوکری کیوں دیں گے؟ کیا یہ سوالیہ نشان ہمیشہ سوالیہ ہی رہے گا؟

بہر حال اب سورج کی طرح چمکتا ہوا حسین چہرہ تو میری نظروں سے چھپ گیا ہے مگر میرے بچوں کو اور مجھے دی گئی ان کی دعاؤں میں سے یہ الفاظ میرے دماغ میں گونج رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے بچوں کے مستقبل کو حسین بنائے، انہیں زندگی اور آسمانی آزمائشوں میں کامیاب فرمائے، اللہ تعالیٰ غربت، تنگدستی و مفلسی سے بچائے، اپنے علاوہ کسی کا دست نگر نہ بنائے، ایمان کی سلامتی عطا فرمائے، اللہ حافظ و ناصر السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ والباقی عند التلاقی۔ ملا کے ساتھ نہیں۔ ٹیلیفون پر یہ آپ کے آخری جملے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی زوجہ محترمہ اور صاحبزادی صاحبہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کے جملہ متوسلین کو بھی صبر وہمت عطا کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جامعہ کراچی کے آخری ایمریٹس

پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام (مرحوم)

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

معروف مورخ ڈاکٹر ریاض الاسلام مختصر علالت کے بعد ۱۳ اگست ۲۰۰۷ء بروز پیر، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اٹھاسی (۸۸) سال تھی۔ بطور پروفیسر، وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے گزشتہ کئی دھائیوں سے وابستہ تھے۔ جامعہ کے یہ آخری ایمریٹس (Emertaus) پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب ۳۰ دسمبر 1919ء کو راجپور (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ یونیورسٹی میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں انہوں نے تاریخ سے بے پناہ رغبت کے باعث اس میں کچھ کرنے کا داعیہ اپنے اندر محسوس کیا اور یہی "داعیہ" پھر ان کی پہچان بن گیا۔ وہ تاریخ کے مضمون میں ڈبل پی ایچ ڈی ہوئے۔ پہلا پی ایچ ڈی 1946ء میں علی گڑھ سے کیا، جب کہ دوسرا 1956ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے جہاں ان کے مقالے کا عنوان تھا۔

"Diplomatic relations between the Mughal Emperors of India and the Safawid Shahs of Iran "

ڈاکٹر صاحب نے کراچی یونیورسٹی کا ہسٹری ڈپارٹمنٹ 1953ء میں بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر جوائن کیا۔ غیر ملکی جرنلز میں ریسرچ آرٹیکلز کے علاوہ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں Sofism in South Asia کے زیر عنوان بہت عمدہ اور اعلیٰ تحقیقی معیار کی حامل کتاب لکھی۔ اس کتاب کے تعلق سے راقم کو ڈاکٹر صاحب سے براہ راست گفتگو کا شرف بھی حاصل ہوا۔ گو ڈاکٹر صاحب سے بہت کم ملاقاتیں رہیں، پہلی ملاقات اس وقت ہوئی، جب میری ایک اسٹوڈنٹ (شیما رہانی لیکچرار گورنمنٹ کالج کراچی) کے پی ایچ ڈی کے عنوانِ مقالہ پر بی اے ایس آر (بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ) نے رفع اعتراض کے لئے ایک کمیٹی بنائی اور بحیثیت سپروائزر مجھے پابند کیا کہ میں ڈاکٹر ریاض الاسلام کی مشاورت سے یہ کیس بی اے ایس آر کو دوبارہ بھیجوں۔ بس اور یہی وہ موقع تھا، جب میں پہلی بار ڈاکٹر صاحب سے ملا اور تصوف کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب، تذکرۃ الصدر کتاب کا پتہ چلا۔ عنوان مقالہ جات کی تعیین پر ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ عنوان کا تعین کرتے وقت دیکھ لینا چاہئے کہ موضوع کی وسعت اور گہرائی کتنی ہے؟ نیز وسعت و گہرائی میں تناسب کیا ہے؟ ان میں اگر کسی بھی ایک چیز کو نظر انداز کیا جائے تو اسے تحقیق کا عنوان نہیں بنانا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ تحقیق کار کو محدود دائرے میں کام کرنے کا موقع دینا چاہئے تاکہ وہ صحیح معنی میں تحقیق کر سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ دائرۂ تحقیق کو بلاوجہ پھیلانے سے تحقیقی عمل متاثر ہوتا ہے۔ یہ مشاورت یقیناً اہم تھی، کیونکہ میری اسٹوڈنٹ کا عنوان تھا۔ "تاریخ اقوام و مذاہب کی روشنی میں تصور تصوف" اور اس عنوان پر ڈاکٹر صاحب کو یہی اعتراض تھا کہ وہ بہت پھیلا ہوا ہے، اسے محدود کیا جائے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی کے بعد اب وہ عنوان، اس عنوان میں تبدیل ہو گیا۔ "تاریخ اسلام کی روشنی میں تصوف کا ارتقاء"۔ یعنی یہ بالخصوص اور دائرہ محدود ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے سندھ کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ جس میں خطے کی متحرک ثقافت اور تواتر سے منتقل ہونے والی وراثت کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے یہ واضح ہو کہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے لئے ۵۰ اور ۹۰ کی دھائیوں میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کتاب "تاریخ ہند و پاک" شامل نصاب رہی ہے۔ 1979ء میں ڈاکٹر صاحب کی ایک تحقیق اور منظر عام پر آئی۔ جو ایران میں کی گئی تھی اور عنوان تھا۔

A Calendar of Documents on INDO-PERSIAN reliations

(1500 - 1750)

اس کتاب کی پہلی جلد راقم کے پاس موجود ہے جو بڑے سائز کے 511 صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ کے کثیر اللسان محقق جانے جاتے تھے۔ اور Ku's Insitute of Central and West Asian Studies کے بانیوں میں سے تھے اور تاحیات سیکریٹری بھی۔ ان کے انتقال پر نہ صرف جامعہ کراچی بلکہ ان کے مضمون سے وابستہ پاکستان کا تمام علمی حلقہ سوگوار ہے۔ 14 اگست 2007ء کو بعد نماز ظہر، جامع مسجد ابراہیم (جامعہ کراچی) میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور جامعہ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نام کتاب: تفہیم المسائل جلد سوئم
تحقیق و تصنیف: پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمن
سن اشاعت: اپریل 2007
صفحات: 502، قیمت: -/250 روپے
ناشر: ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین اہلسنت کے ہزاروں مدارس کے امتحانی بورڈ تنظیم المدارس کے صدر اور اسی مکتبِ فکر کی جماعتوں اور تنظیموں کی رہبر کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمن صاحب کی مصروفیات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بحیثیت دار العلوم نعیمیہ میں کل وقتی اور سفیر اسلام و مبلغین اندرون و بیرون ملک کے سفر، مختلف مسائل و معاملات پر سرکاری، غیر سرکاری، مسلم، غیر مسلم وفود، افراد اور تنظیموں سے بحث و تمحیص جیسی اضافی مصروفیات کے باوجود قلم بدست رہنا اور 502 صفحات پر مشتمل تفہیم المسائل کی تیسری جلد کا عوام و خواص کو تحفہ دینا لائق تحسین ہے۔ مفتی صاحب کی شخصیت قدیم و جدید علوم کا حسین امتزاج ہے، اغیار و اغیار اہل علم ان کی اصابت رائے، مسائل میں گہری نظر اور علمی و فکری صلاحیتوں کے قلب کی گہرائیوں سے معترف ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ مفتی صاحب تفسیر سورۂ نساء کی طرز پر انشاء اللہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر کا تحفہ ملت اسلامیہ کو ضرور عنایت فرمائیں گے۔

تفہیم المسائل کی یہ تیسری جلد تیرہ ابواب اور تیرہ ہی متفرق مسائل کے تفصیلی اور محققانہ جوابات پر محیط ہے، اس میں روایتی مسائل کے جوابات بھی ہیں اور ارتقاء پذیر عہد کی پیداوار جدید مسائل کے جوابات بھی۔ نیز بعض ایسے مسائل کہ جن کے بارے میں فقہ کے بنیادی ماخذ خاموش ہیں ان کے تفصیلی جوابات بھی ہیں، روایتی اور درایتی تمام مسائل و جوابات کا احاطہ تو ناممکن ہے البتہ چند ایک کا اشاریہ پیش خدمت ہے۔

کتاب العقائد میں، غیر صحابی کیلئے رضی اللہ عنہ کہنے کے جواز پر قرآنی آیات، روایات اور اقوال فقہاء کے ذخیرہ سے مدلل جواب تحریر فرمایا ہے اور نتیجہ میں فرمایا ہے کہ رضی اللہ عنہ، رحمۃ اللہ علیہ، رحمہ اللہ تعالیٰ، غفر اللہ لہ، غفرلہ، عفا اللہ عنہ اور عفی عنہ جیسے کلمات اللہ کے مکرم و مقرب بندوں کیلئے ڈگریاں نہیں بلکہ یہ کلمات دعا، ہیں۔ البتہ صحابہ کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعزازات و انعامات ہیں لہٰذا صحابی، غیر صحابی کیلئے یہ کلمات بلاتفریق کہے اور لکھے جاسکتے ہیں۔

اسی طرح کتاب الصلوٰۃ میں ہر بڑے اور گنجان آباد شہر میں نمازیوں کو درپیش ایک اہم مسئلہ کی

عقدہ کشائی کی گئی ہے کہ چھوٹی سی جگہ پر تعمیر شدہ کئی منزلہ مسجد میں جب امام فرسٹ یا سیکنڈ فلور پر امامت کے فرائض انجام دیتا ہے اور نمازی گراؤنڈ فلور پر شریک جماعت ہوتے ہیں تو امام کے تفوق اور نمازیوں کی سطحیت میں واضح تفاوت سے اقتداء جائز ہے یا نہیں؟ تو مفتی صاحب نے اپنی تحقیق انیق سے نمازیوں کی شرکت جماعت کو جائز قرار دیا ہے اسی طرح نماز قصر کے حوالے سے دو سوالات کے جوابات اسلاف کی معلومات میں مگر انداز جدید میں اس طرح دیئے گئے ہیں کہ ہر مسافر آسانی مسافت قصر کا تعین کرسکتا ہے۔ یعنی مسافت قصر اٹھارہ فرسخ کو پہلے گزوں، میلوں اور پھر کلومیٹر میں بتاکر جہاں مفتی نظام الدین شامزئی کے پیدا کردہ ابہام کو دور کیا گیا ہے وہاں حیدرآباد کے جس مفتی نے 92 کلومیٹر کو مسافت قصر قرار دیا تھا، اسے بھی غیر صحیح قرار دے کر صحیح مقدار تحریر کردی ہے جو کہ یہ ہے 54 میل شرعی جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی انگریزی اسٹینڈرڈ میل دو فرلانگ میں گز ہیں اور یہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلومیٹر کے برابر ہے۔ تفہیم مسئلہ میں یہ جدید طریقہ اجتہاد کی ایک شاخ ہے جس پر مفتی صاحب کو یدطولیٰ حاصل ہے۔۔۔۔۔ اسی باب میں ایک اور اہم مسئلہ بھی موجود ہے جو حالات حاضرہ کے تناظر میں زبان زد عام و خاص ہے یعنی بغیر لیز یا الاٹمنٹ کے سرکاری زمین پر مسجد کی تعمیر اور اس کی شرعی حیثیت؟ مفتی صاحب نے جو مدلل فتویٰ جاری فرمایا ہے وہ ان کی فقاہت اور بالغ نظری پر شاہد ہے کہ گورنمنٹ خود کوئی ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کرتی ہے یا پرائیویٹ سیکٹر کو ہاؤسنگ سوسائٹی کیلئے زمین مہیا کرتی ہے مگر دونوں صورتوں میں مسجد کیلئے کوئی جگہ نہیں رکھی، پھر ان سوسائٹیز کے مکینوں نے کسی بھی خالی جگہ پر مسجد قائم کرلی، بعد ازاں سرکار نے اپنے نقشہ جات یا لے آؤٹ پلان میں اس جگہ پر مسجد دکھادی تو وہ جگہ مسجد کیلئے مختص شمار ہوگی چاہے گورنمنٹ سوسائٹی کو مسجد کی جگہ لیز یا الاٹمنٹ جاری کرے یا نہ کرے، ایسی مسجد میں نماز جائز ہے۔ ایسی مسجد کو ختم کرنا یا شہید کرنا درست نہیں۔

اسی طرح کتاب الجنائز میں بھی ایک اہم فتویٰ ہے کراچی میں میوہ شاہ قبرستان میں سینکڑوں قبروں میں مدفون مرحومین کے ورثاء اس فتویٰ سے مدد حاصل کرسکتے ہیں، مفتی صاحب نے میت کی باقیات کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کرنے کے حوالے سے احادیث مبارکہ اور اقوال فقہاء کی روشنی میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ مسلمان کی قبر کو کھودنا سخت حرام ہے، اسلامی سلطنت ہو تو ایسا شخص مستحق تعزیر ہے کیونکہ انتقال میت حرام ہے، اگر متعلقہ محکموں کے لوگ طاقت کے بل پر قبروں کو بلڈوز کرنا چاہیں تو بھی بلڈوز کرنے سے قبل قبر کو کھودنا اور باقیات میت کو نکال کر منتقل کرنا درست نہیں ہے۔

ساتویں باب کتاب الحج میں بھی ایک اہم ترین مسئلہ یعنی خواتین کا بغیر محرم کے سفر حج کا ایسا مد

© rasailojaraid.com